(غلام گردش)

چاندنی کی ٹہنی

ہارون الرشید، مسلمانوں کے حد درجہ عالی شان خلیفہ تھے۔ عباسی خلفاء ہی میں نہیں، اسلامی تاریخ کے نا قابل فراموش کردار۔ انکی دولت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ دنیاوی بادشاہوں میں شائد سب سے متمول۔ شاہی قافلہ چلتا تو ہزاروں گھڑسوار ساتھ آسودہ ہوتے۔ تلوارں سے آراستہ اَن گنت محافظ، بیش قیمت لباس پہنے ساتھ ہوتے۔ خلیفہ نے بغداد کو دنیا کا مرکز بنا دیا تھا۔ علم دوست مگر جفاکش۔ آج جو حیثیت نیویارک، پیرس اور لندن کو ہے، وہی اسکے زمانے میں بغداد کو تھی۔ کرہِ اَرض پر سب سے خوشحال شہر۔ اَل طبری لکھتا ہے کہ رومیوں کو ایک جنگ میں شکست دیکر جب خلیفہ کا لشکر واپس آیا تو بیس ہزار خچروں پر مالِ غنیمت لدا ہوا تھا۔ ہیرے جواہرات، سونا، چاندی، ہر طرح کا محیر العقول خزانہ موجود تھا۔ اسی پرشکوہ سلطان کا ایک بیٹا فقر اور درویشی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔ موٹے اور کھردرے کپڑے پہنتا۔ سارا دن قرآن شریف کی تلاوت کرتا۔ قبرستانوں میں بیٹھ کر وقت گزارتا اور زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا۔ ایک دن، ہارون دربار میں موجود تھا۔ بھرپور، سجا ہوا دربار۔ وزراء قیمتی لباس میں ملبوس قطار اندر قطار موجود تھے۔ فوجی جرنیل اپنے جلالی انداز میں مودب کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک شہزادہ دربار میں داخل ہوا۔ اس نے ایک پھٹے ہوئے کمبل کا بنا ہوا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ سر پر ایک سفید رنگ کی میلی کچیلی پگڑی تھی۔ پورے جسم پر ایک بھی قیمتی چیز موجود نہیں تھی۔ وزراء اور درباریوں نے جب اتنے خستہ حال میں شہزادہ کو دربار میں آتے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ لڑکا، اپنے باپ کی عزت کو ہر جگہ کم کرتا ہے۔ کہاں ہارون الرشید جیسا عالی شان اور عالی مرتبت بادشاہ اور کہاں یہ فقیروں جیسے حلیے والا بیٹا۔ یہ تو شہزادہ لگتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کم ظرف ہے جو ہر جگہ اپنے بادشاہ کو ذلیل کرواتا پھرتا ہے۔ بہر حال شہزادہ، خلیفہ کے نزدیک جا کر کھڑا ہوگیا۔ بادشاہ کو بھی اسکا ادنیٰ لباس پسند نہ آیا۔ اس نے درشت طریقے سے ڈانٹا اور پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔ تم اس حال میں کیوں یہاں آئے ہو۔ تمام درباری دم بخود تھے کہ اب کیا ہوگا۔ شہزادہ نے سلطان سے کہا کہ اَبا حضور! آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔ شہر چھوڑ کر کسی اور جگہ جانا چاہتا ہوں۔ محنت مزدوری کر کے روزی کمانا چاہتا ہوں۔ اور خدا کے کام میں زندگی وقف کرنا چاہتا ہوں۔ مگر کیوں، تم خلیفہ کے بیٹے ہو۔ کس چیز کی کمی ہے۔ شہزادے کے اصرار پر بادشاہ نے فیصلے کیلئے ایک دن کا وقت مانگا اور حکم دیا کہ کل آنا۔ مفلوک الحال شہزادہ نے دربار میں ایک عجیب حرکت کی۔ نزدیک بیٹھے ہوئے پرندے کو کہا کہ میں خدا کے توسط سے تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے کندھے پر آ کر بیٹھ جاؤ۔ اسی طرح ہوا۔ اذن الٰہی سے وہ پرندہ آیا۔ شہزادہ کے کندھے پر بیٹھا اور جب اس نے کہا کہ واپس چلے جاؤ، تو اُڑ کر درخت پر واپس چلا گیا۔ ہارون الرشید یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خیر اگلے دن، اسے محل میں بلایا۔ حد درجہ بحث کے بعد اسے بغداد سے جانے کی اجازت دی۔ چلتے ہوئے ایک انتہائی قیمتی انگوٹھی حوالے کر دی کہ ضرورت پڑی تو اسے فروخت کر کے گزارہ کر لینا۔ شہزادہ انتہائی مفلسی میں بغداد سے نکلا اور بصرہ کے نزدیک ایک ویرانے میں گوشہ نشین ہوگیا۔ وہ سات دنوں میں صرف ہفتہ والے دن مزدوری کیلئے شہر جاتا تھا اور صرف ایک درہم معاوضہ لیتا تھا۔ باقی چھ دن یادِ الٰہی میں بسر کرتا تھا۔ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ خلیفہ وقت کا بیٹا ہے۔

شہر میں ابو عامر نام کے ایک امیر آدمی کو اپنی دیوار بنوانی تھی۔ اتفاق سے ہفتہ کا دن تھا۔ شہزادہ بازار میں مزدوروں کے ہمراہ روزی کمانے کیلئے بیٹھا ہوا تھا۔ ابو عامر نے دیوار بنانے کیلئے بلایا تو اس نے دو شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ نماز کے وقت کام نہیں کریگا۔ دوسرا، اُجرت صرف ایک درہم لیگا۔ ابو عامر نے کہا کہ درست۔ دیوار بننی شروع ہوئی۔ شام تک کافی کام ہو گیا۔ ابو عامر جب کام دیکھنے آیا تو حیران رہ گیا۔ ایسے لگتا تھا کہ دس بارہ لوگ مسلسل کام کرتے رہے ہیں۔ خوش ہو کر مزدور شہزادے کو دس درہم دیے۔ تو اس نے صرف ایک درہم رکھا اور باقی واپس کر دیے۔ طے یہ پایا کہ وہ مزدور ہفتے والے دن آ کر دیوار بنایا کریگا۔ اگلے ہفتہ دوبارہ یہی سلسلہ ہوا۔ ابو عامر نے تجسس سے چھپ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مزدور کام کرتے ہوئے قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہے۔ کام اس تیزی سے ہو رہا ہے جیسے مزدور کے ساتھ کوئی غیبی طاقت ہو۔ اور درجنوں لوگ کام کر رہے ہوں۔ بہر حال اگلے ہفتے جب مزدور نہ آیا۔ تو ابو عامر اسکی تلاش میں جنگل تک پہنچ گیا۔ وہاں شہزادہ بیماری کی بدولت جانکنی کی حالت میں تھا۔ ایک اینٹ تکیہ کی جگہ رکھی ہوئی تھی۔ ابو عامر کی آواز سنکر کہا کہ آؤ، مجھے آپکا ہی انتظار تھا۔ دیکھ میں دنیا سے جا رہا ہوں۔ مجھے پرانے کپڑوں کے کفن میں دفنانا۔ کیونکہ نئے کپڑوں پر زندہ آدمیوں کا حق ہے اور یہ انگوٹھی، خلیفہ وقت، ہارون الرشید کو دے دینا۔ ابو عامر کو یاد آیا کہ نئے کپڑوں والا جملہ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ سے منسوب تھا۔ اس نے مزدور کی وصیت پر عمل کیا۔ پرانے کپڑوں میں تدفین کی اور بغداد روانہ ہو گیا۔ خلیفہ کی خدمت میں پیش ہوا اور اسے انگوٹھی دیدی۔ ہارون الرشید نے دربار موقوف کیا اور ابو عامر کو اپنے ذاتی محل میں لے گیا۔ وہاں تمام ملازمین کو باہر نکال دیا۔ پوچھا کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی۔ جب ابو عامر نے قصہ بیان کیا تو خلیفہ پر رقت طاری ہو گئی۔ زار و قطار گریہ کرنے لگا۔ ابو عامر کو کہا کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ مجھے بہت بڑا سبق سکھا گیا ہے۔ پھر ہارون نے روتے ہوئے کہا کہ میرا بیٹا تو ٹھنڈی روشنی اور چاندنی کی ٹہنی تھا۔ بہت جلد، اپنے خالق کے پاس چلا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہارون الرشید میں اَز حد تبدیلی آ گئی۔ خدا خوفی حد درجہ بڑھ گئی۔ زندگی کے بعد کے معاملات میں حد درجہ سنجیدہ ہو گیا۔

یہ واقعہ یا حکایت چند دن پہلے نظر سے گزری ہے۔ مگر اس وقت سے گہری سوچ میں ہوں۔ بنیادی طور پر سائنس کا آدمی ہوں۔ عمل اور ردِ عمل کی دنیا کا آدمی۔ حد درجہ یقین ہے کہ خدا نے یہ زندگی انسان کو سخت محنت کیلئے عطا کی ہے۔ تاریخ اسلام پڑھتا رہا ہوں۔ یہی سمجھا ہوں کہ رسول کریمؐ کی تمام زندگی عمل کی زندگی تھی۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک دن، صرف اور صرف شدید مشقت سے گزرا ہے۔ پھر اعلیٰ کردار اور بلند ترین اخلاقی اُصولوں پر کام کرتے ہوئے ہر دنیاوی مصیبت کا سامنا کیا تھا۔ جنگ بدر سخت کوشش سے لڑی تھی۔ آقاؐ کی زندگی کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جہاں تن آسانی، آرام اور دنیا سے محبت کا سبق ملتا ہو۔ اگر جوہری طور پر دیکھا جائے تو رسول کریمؐ بھی قبرستان جا کر قبروں میں سوئے ہوئے لوگوں کو یاد کرتے تھے۔ صحابہ کو فرماتے تھے کہ تمہیں علم نہیں کہ قبروں میں ان پر کیا گزر رہی ہے۔ موت کو اکثر یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ مگر زندگی میں عمل کی قوت کو کبھی کم نہ ہونے دیا۔ ایسا خوبصورت توازن دوبارہ کسی انسان کو نصیب نہ ہو پایا۔ تاریخ ہی سے کشید کیا ہوا اُصول ہے کہ انسان کی زندگی محنت سے بھرپور ہونی چاہیے۔ مگر یہاں ایک لمحے کیلئے ٹھہر جایئے۔ انسان کی زندگی کسی نہ کسی انجانے مرحلے پر ختم ہونی ہے۔ یہ لامتناہی تو نہیں ہے۔ ہمارے پاس یہی چند دہائیاں ہی تو ہیں

اوراسکے بعد، ابدی زندگی ہے جس سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ مانیے یا نہ مانیے۔ موت، انسان کی زندگی کی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی دنیا کی زندگی کا عمل۔ اور ہاں، پھر حساب و کتاب۔ گناہ اور ثواب کی بنیاد پر خدا کی طرف سے مکمل انصاف۔ غور سے سمجھیے تو ہمارے دین کا نظامِ، حیات، عمل، موت اور اسکے بعد کے حساب و کتاب پر مبنی ہے۔ یہ وہ ازلی حقیقت ہے جس پر قرآن میں ہر جگہ پر استدلال موجود ہے۔ اور آقاؐ کی زندگی کا ہر لمحہ اسکی عملی گواہی دے رہا ہے۔ مگر آپکی فکر کو دوبارہ روکنا چاہتا ہوں۔ اردگرد دیکھیے۔ اَن گنت لوگ مصروفِ کار نظر آئینگے۔ ہر طرح کے کام میں مشغول۔ کوئی پیسہ کمانے میں برباد ہے اور کوئی جائیداد کو اتنا بڑھاوا دینے میں، کہ اسکی سات پشتیں سنور جائیں۔ مگر ایک چیز مجھے نظر نہیں آئی۔ کہ ہمارے عمل میں اتنی زیادہ کجی ہے کہ لگتا ہے کہ کسی کو موت پر واقعی یقین ہی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خدا کی عدالت دیکھنی ہی نہیں ہے۔ شائد آپکو یہ جملہ مناسب نہ لگے۔ مگر میں عملی دنیا میں ناانصافی، ظلم، ایک دوسرے کے حقوق کو غضب کرنے کا وطیرہ اور ہر ناجائز طریقے سے دولت کمانے کی ہوس میں مبتلا لوگوں کو دیکھ کر کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔ کچھ اور نہیں لکھ سکتا۔

بات حکمرانوں کے مظالم تک محدود نہیں ہے۔ غریب بھی اتنا ہی ظالم ہے۔ عوام کے کردار میں ہر سطح پر ظلم کی گہری چھاپ موجود ہے۔ اوپر سے نیچے تک تقریباً ہر شخص دولت کمانے کی دوڑ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہے۔ اور کر بھی رہا ہے۔ کسی بازار میں چلے جائیں۔ آپکو اکثریت دکاندار حد درجہ دیندار نظر آئینگے۔ مگر جب آپ مال یا جنس خریدیں گے تو معلوم ہوگا کہ یا تو نرخ زیادہ ہے اور یا پھر اسکا معیار حد درجہ کمزور ہے۔ پھل بیچنے والا، آپکو اچھا پھل دکھائے گا۔ مگر آپکو دیگا انتہائی گلا سڑا فروٹ۔ گوشت بیچنے والے کی مکمل کوشش ہوگی کہ آپکو اچھا گوشت نہ فروخت کرے۔ دودھ بیچنے والا آپکو خالص دودھ دینا گناہ سمجھے گا۔ یہ تمام باتیں ہر ایک کے علم میں ہیں۔ آپکی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کر رہا۔ مگر کیا وجوہات پر غور کرنا ضروری نہیں؟ کیا اس اخلاقی بگاڑ کے اسباب پر فکر کرنا لازم نہیں؟ بالکل ہے۔ یہی وہ سنجیدہ ترین نکتہ ہے جس پر بحث ہونی چاہیے۔ دیکھا جائے تو ہمیں موت پر بالکل یقین نہیں ہے۔ ہم روزِ قیامت کے حساب کو بھی اس سنجیدگی سے نہیں لیتے جو بطور مسلمان ہم پر فرض ہے۔ یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیجئے۔ ہم لفظی سطح کے مسلمان ہیں۔ ہماری ظاہری عادات مسلمانوں جیسی ہیں مگر اس سے آگے مکمل خاموشی ہے۔

متوسط اور غریب طبقے کو تو خیر چھوڑیے۔ حکمران اور امیر طبقے کی عملی حالت دیکھیے۔ آپکو وہ اخلاقی انحطاط نظر آئیگا کہ انسان چکرا جاتا ہے۔ ہمارے مذہب میں جائز دولت کمانا بالکل مستحسن فعل ہے۔ مگر ناجائز دولت کی پکڑ حد درجہ زیادہ ہے۔ ہم سارا دن لادین معاشروں پر بے پناہ تنقید کرتے ہیں۔ مگر کہیں ایمانداری، انصاف، ناپ تول کا درست نظام اور سچائی نظر آتی ہے، تو یہ چیز ''بھٹکے ہوئے ممالک'' میں ہی ہے۔ ہمارا تو پورا نظام اور معاشرہ اس روش پر دوڑ رہا ہے، جسکی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ ناانصافی ہر سطح پر بھرپور طریقے سے حکومت کر رہی ہے۔ جھوٹ کا مکمل دور دورہ ہے۔ ملاوٹ، اقربا پروری، خیانت ہماری رگ رگ میں شامل ہے۔ عملی بات کر رہا ہوں۔ اگر موت یاد ہوتی تو یہ حالات نہ ہوتے۔ اتنی اخلاقی پستی بھی موجود نہ ہوتی۔ پھر اس دانش مند شہزادے کی بات یاد آتی ہے جو اپنے باپ یعنی خلیفہ ہارون الرشید کی پوری سلطنت کو ٹھکرا کر ویرانے میں چلا گیا تھا۔ اسے زندگی کی بے ثباتی پر یقین تھا اور اپنی دنیاوی

زندگی کیلئے محنت مزدوری کرنے پر بھی۔ وہی شہزادہ، جسکے متعلق خلیفہ نے کہا تھا کہ وہ تو چاندنی کی ٹہنی کی مانند تھا!

راؤ منظر حیات